© rasailojaraid.com

قائدِ اعظم اور وفاقی طرزِ حکومت

(۱)

برصغیر پاک و ہند میں دستوری سفارشات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ریگولیٹنگ ایکٹ سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اس برصغیر کی قسمت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں رہی اور نظم و نسق کے لیے برطانوی طرز کا دستوری ڈھانچہ اہمیت اختیار کرتا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں حکومت کا نظم و نسق براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت ہوا اور دستوری اصلاحات کی جو قسطیں وقتاً فوقتاً رائج کی گئیں ان کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما تھا کہ برصغیر کے باشندوں کو ترقی و تمدن سے روشناس کرانے کا فریضہ حاکموں کے سپرد رہے ہے، لیکن پس ماندگی کے سبب جمہوری اداروں کی ابھی کوئی گنجائش نہیں۔ اس نقطۂ نظر نے غیر ملکی تسلط کے لیے جواز بھی مہیا کیا اور حاکم و محکوم کے تعلقات کو ایک خاص نفسیاتی پس منظر بھی عطا ہوا۔ چنانچہ جلد ہی مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور آزادی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

انیسویں صدی میں برطانوی سیاسی مفکرین کے خیالات اور آزادی اور جمہوریت کے بارے میں نئے دعاوی نے برصغیر میں تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ قدم جمانے شروع کیے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوؤں کے ساتھ امتیازی سلوک نے مادی ترقی اور تعلیمی پیش رفت میں برطانوی جانب داری ہی کو ظاہر نہیں کیا بلکہ اس سے برصغیر کی تمدنی زندگی کا توازن معدوم ہوا اور جغرافیائی وسعتوں پہ برطانوی اقتدار نے یک جہتی کا جو غلاف چڑھایا تھا وہ بھی تار تار ہونے لگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی، مذہبی اور فکر و نظر کے فاصلے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں الگ الگ دوائر کے طور پر موجود تھے، اب مادی عناصر کے زیرِ اثر شعوری سطح پر کھل کر سامنے آ گئے۔ برصغیر کی آبادی میں ہندو اور مسلمان دو فیصلہ کن ملاپ اور موثر عددی اکثریتیں تھیں جن کے فکری اور ثقافتی سرچشمے ایک دوسرے سے علیحدہ اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ایک نئی شکل میں تھے۔ مادی عوامل نے اختلافات کو خارجی سطح پر دو متحارب گروہوں کی آویزش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے طور پر مشخص کیا۔

(۲)

سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم تحریکوں سے اجتناب کا مشورہ دیا تھا۔ در بادی اور تعلیمی میدان میں پسماندگی دور کرنے کے لیے کانگرس سے علیحدگی پر اصرار کیا اور مغربی جمہوری اداروں کو دو وجوہ سے ہند کی سرزمین کے لیے اجنبی اور نقصان دہ قرار دیا۔ اول یہ کہ ہندوستان کی جغرافیائی ساخت اسے ایک ملک کی بجائے ایک برصغیر قرار دینے کا تقاضا کرتی تھی۔ دوسرے اس لیے کہ مغربی جمہوری اقدار ہندوؤں کی عددی برتری کی بنا پر مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے لیے زہر کا حکم رکھتی تھی۔ اس دوگونہ احساس نے سرسید کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ الیکشن کے ذریعہ نمائندگی کا طریق ایسے ملکوں میں جہاں کی آبادی ایک نسل یا ایک ہی مذہب پر مشتمل ہو موزوں ترین نظام ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ذات پات کا امتیاز ابھی تک محدود ہے، جہاں مختلف نسلیں ارتباط و آمیزش کے عمل سے یک جان نہیں ہوئیں، جہاں مذہبی امتیازات ابھی تک شدت سے برقرار ہیں، جہاں جدید تعلیم سے آبادی کا ہر طبقہ یکساں طور پر مستفیض نہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انتخاب کے اصول کو لوکل بورڈوں اور قانونی کونسلوں کے لیے رائج کرنا لاتعداد خرابیوں کا باعث ہوگا اور بڑا فرقہ چھوٹے فرقوں کے مفادات کو پس پشت ڈال دے گا۔[۱]

آئینی حدود میں اس احساس نے مسلمانوں کو تحفظات کے مطالبے کا سبق سکھایا۔ چنانچہ مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی تاریخ میں تحفظات کا مطالبہ ہر زمانے میں اہم اور فیصلہ کن عنصر رہا۔ آئینی حدود میں الگ نیابت کا پہلا مطالبہ بھی اسی احساس کا شاخسانہ تھا۔ مسلمانوں نے سرسید کی وفات کے بعد سیاسی طور پر اپنے آپ کو منظم کرنے کے لیے جب الگ جماعت کی ضرورت محسوس کی تو سب سے پہلے جو نصب العین ان کے پیش نظر تھا وہ یہی الگ نمائندگی ہی کا تصور تھا۔ جمہوری اداروں میں الگ نشستوں کا تعین، حلقہ ہائے انتخاب کا الگ اہتمام و انصرام، ملازمتوں میں الگ کوٹہ — یہ سب مطالبے اسی احساس کا نتیجہ تھے کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کے حقوق کی محافظ نہ ہو سکتی تھی۔

---

[۱] ۱۸۸۳ء کے ایکٹ پر سرسید احمد خان کی تقریر کا مقدمہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳)

آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو کم از کم دو صوبوں میں ہندوؤں پر کسی حد تک عددی برتری حاصل تھی۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمان ۱۹۲۸ء تک بھی ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تھے اگرچہ یہ فرق کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ پنجاب میں اس وقت مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۴ء۳ فی صد اور بنگال میں ۵۴ فی صد تھا۔ جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اگر ان علاقوں میں بالغ رائے دہی اور خواندگی کا اصول اپنایا جائے تو یہ برتری بآسانی اقلیت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ ہندو کانگرس مسلمانوں کے اس کمزور پہلو سے آگاہ تھی۔ ۱۹۱۶ء میں اتحاد کی جو صورت پیدا ہوئی تھی اور کانگرس نے جن تحفظات کی ضمانت دی ۱۹۲۷ء میں اس پر عمل کی ضرورت نہ رہی۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو منتشر کر دیا تھا۔ مسٹر گاندھی نے تحریک کا ساتھ دے کر اور ترکِ موالات اور ہجرت کی حوصلہ افزائی کر کے مسلمانوں کو اس حد تک مایوس و بے بس کر دیا کہ کانگرس کے مقابلے میں کوئی مؤثر آواز باقی نہ رہی۔ جداگانہ رائے دہی اور جداگانہ انتخابات سے مسلمانوں کے الگ تشخص کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ دو صوبوں میں عددی اکثریت نے ہندوؤں کے دلوں میں کھٹک پیدا کر دی۔ نہرو رپورٹ کے خالقین بھی ہندوستان کی دو اہم سرحدوں پر مسلمانوں کی عسکری تربیت کے سبب بھی خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ شمال میں افغانستان اور جنوب میں نئے ابھرتے ہوئے ایشیائی ممالک کے درمیان مسلمان آبادی کا اکثریتی وجود آسانی سے برداشت نہ ہو سکتا تھا اور اب جب کہ مسلمان داخلی طور پر مجروح اور بے اثر ہو چکے تھے، پرانے وعدوں سے پھر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت بالغ رائے دہی تعلیمی قابلیت اور مالی حیثیت کی حد بندیوں میں بخوبی غیر مؤثر ہو سکتی تھی۔ اگر پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تحفظ مل جاتا تو برابری کی بنیاد پر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں مسلمان اپنے مطالبات کو بھی مؤثر اور قابلِ عمل بنا سکتے تھے خصوصاً جب کہ جغرافیائی لحاظ سے وہ سرحدوں پر "قابض" بھی ہوں۔ سرحدوں کا یہ ہوا کانگرس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اب یہ ضروری بھی تھا اور اس کا موقع بھی آ گیا تھا کہ مسلمانوں کو اکثریت میں جذب کرنے کے عمل کو تیز تر کر دیا جائے۔ نہرو رپورٹ کانگرس کا وہ ہتھیار ہے جس کی مدد سے مسلمانوں کے حقوق پر پہلی ضرب لگائی گئی۔ نہرو رپورٹ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہندوستان ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے اور یہاں کے باشندے ایک واحد قوم ہیں۔ برطانوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقتدار کے تحت ہندوستان ایک انتظامی اکائی تھا اسی اکائی کو اب قومی وحدت بنا کر ہندو اکثریت کے غلبے کے لیے جمہوری بنیاد مہیا کر دی گئی۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ قائدِ اعظم کی قیادت میں الگ نیابت کے مطالبے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار تھا بشرطیکہ کانگرس پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی عددی اکثریت کے مطابق نشستیں دے دے، لیکن یہ تجویز بھی حقارت سے ٹھکرا دی گئی مسلمانوں کی آیندہ آئینی جدوجہد کا محور ایک اساسی حقیقت کے دو رُخ تھے۔

۱۔ مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں اور الگ حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ۔

۲۔ مرکز میں کسی ایسے نظام کی تلاش جس میں اکثریتی آبادی اپنی عددی قوت کے ذریعے مختار مطلق نہ ہو جائے۔

ان دو مطالبوں کی اوّلین پرچھائیاں بہت پہلے سے طلبِ حقوق کی جنگ میں نظر آنے لگی تھیں۔ مطالبات کا یہ دو شاخہ (جس میں وفاقی طرزِ حکومت کو نمایاں مقام حاصل ہے) چشم زدن میں مسلمانوں کا آئینی مؤقف نہیں بنا بلکہ آہستہ آہستہ ان کی فکری زندگی میں ظہور پذیر ہوا۔ ۱۹۱۹ء کے قوانین کے گرد و پیش اس کے ابتدائی آثار نظر آنے لگے تھے۔

(۴)

برطانوی حکام کا نقطۂ نظر بیسویں صدی کے اوائل تک یہی تھا کہ یہ سرزمین جمہوریت کی نشوونما کے لیے فی الحال سازگار نہیں ہے لیکن جب سیاسی بیداری کی تحریکوں نے ایک مؤثر دباؤ کی شکل اختیار کر لی تو ایک بار پھر ۱۹۱۹ء میں برطانوی حکومت کو دستوری اصلاحات کی ایک اور قسط کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب برطانوی مقبوضات کے دوسرے حصوں میں بھی حقوق کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد دنیا کے نقشے میں کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں اور حکومت کے مختلف نظام تجرباتی منزل سے نکل کر مکمل صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کینیڈا اور آئرلینڈ میں جدوجہدِ آزادی نے (DOMINION STATUS) کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزادی خواہ عناصر نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ برطانوی حکومت کی منطق اب اپنا اثر کھو چکی ہے۔ اس زمانے تک دنیا میں بڑے نظام ہائے حکومت اپنی مکمل صورت میں پہچانے جا رہے تھے۔ وحدانی طرزِ حکومت اور وفاقی طرزِ حکومت کے سانچے اپنی فلسفیانہ تعبیروں کے علاوہ ملکوں کے مزاج اور جغرافیائی حالات پر منطبق ہو کر افا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر کر رہے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں جمہوری اقدار کے عمل اور ردِ عمل نے فکری سطح پر جو تبدیلیاں پیدا کیں ان کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ وحدانی طرزِ حکومت میں برصغیر کی ہندو اکثریت غلبہ حاصل کرتی، اس کے مقابلے میں وفاقی طرزِ حکومت ریاستوں کے اختیار اور عمل کو آزاد رکھ کر اس بات کی ضمانت دیتی تھی کہ برصغیر کی دوسری بڑی اکثریت (یعنی مسلمان) بھی ان علاقوں میں جہاں وہ اکثریت میں تھے، اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اور ہندو مداخلت سے آزاد رکھ سکیں۔ وفاقی طرزِ حکومت برصغیر کے جغرافیائی حالات میں کچھ زیادہ ہی کامیابی کے امکانات رکھتی تھی۔ بعض خصوصی تحفظات اور مرکز میں توازن کے کچھ خاص انتظامات کی موجودگی میں پورے برصغیر میں ایک ہی وفاقی حکومت کا قیام اس زمانے میں اس لیے بھی مفید نظر آتا تھا کہ تحریکِ خلافت میں ہندو مسلم اتحاد نے ہنگامی اور ہم کاری کی توقعات پیدا کر رکھی تھیں۔

(۵)

اس پس منظر میں مسلمان تو الگ حقوق اور وفاقی طرزِ حکومت کے مطالبات کی طرف جا رہے تھے۔ اور کانگرس کی قیادت متحدہ قومیت کے نشے میں زیادہ سے زیادہ تنگ نظر اور غالی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی مساعی خاصی کامیاب تھیں۔ اتحاد کی ان کوششوں میں قائد اعظم محمد علی جناح پیش پیش تھے۔ قائد نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگرس کے پلیٹ فارم سے کیا تھا اور نیشنلسٹ خیالات کو اپنانے کے لیے معتدل سیاسی مؤقف کی حمایت کی تھی۔ مسلم لیگ میں ان کی شرکت دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور متحدہ محاذ قائم کرنے کی ترغیب ہی کا نتیجہ تھی۔ یہ مساعی اوّل تحفظات کی ضمانت کے سہارے بار آور ہوئیں لیکن تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا طوفان اتر جانے کے بعد حالات نے ایک بالکل دوسری کروٹ اختیار کی۔ کانگرس کی روش میں شدت اور سختی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس سختی کا ادراک و احساس مسلمانوں کو وفاقی طرزِ حکومت کی افادیت کا زیادہ قائل کرتا چلا گیا۔ نہرو رپورٹ کے دوراہے پر پہنچنے سے پہلے ہی مسلمانوں نے وفاقی طرزِ حکومت کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔

۲۵ مئی ۱۹۲۴ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی اور تجویز کیا کہ وفاقی طرزِ حکومت ہندوستان کی آیندہ سیاسی جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ یہ قرارداد شیخ عبدالقادر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے پیش کی اور اس کی تائید شیخ نیاز محمد نے کی تھی - اس شش شقی قرارداد میں وفاقی دستور کے سلسلے میں ذیل کے جملے ملتے ہیں :

ہندوستان کے تمام موجودہ صوبے وفاقی اساس پر ایک مشترک حکومت کے تحت اس طرح متحد کر دیے جائیں کہ ہر صوبہ کو پوری اور مکمل صوبائی خود اختیاری حاصل ہو اور مرکزی حکومت کے اختیارات صرف ایسے امور تک محدود ہوں جن کا تعلق عام اور مشترک مسائل سے ہو۔

اس قرارداد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات اور کانگریس کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں کس قدر حقیقت پسند بنا دیا تھا۔

یہ قرارداد بھی اسی دوشاخے نصب العین پر مشتمل ہے جس میں آیندہ صوبوں کی حدود میں رد و بدل کے لیے پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد کی اکثریت کی مرضی کو لازم قرار دیا گیا تھا مسلمانوں کے اندیشے پنجاب اور بنگال کے علاوہ صوبہ سرحد میں مسلم اکثریت کے تحفظ کے گرد گھوم رہے تھے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ما بعد کے ادوار میں مسلم اکثریتی علاقوں کے بارے میں کانگرس کا رویہ آزاد ملک کے مطالبے کے لیے کس حد تک فیصلہ کن اور قوی عنصر ثابت ہو سکتا تھا۔ صوبہ سرحد کو اس زمانے تک پورے صوبے کے حقوق حاصل نہ تھے۔ کم و بیش اسی دور میں سرحد کو صوبہ کا درجہ دینے کے لیے قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی طرح ۱۹۲۵ء کے اجلاس میں سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنانے کی تجویز محض مولوی رفیع الدین احمد (محرک) اور گل محمد خان (مؤید) نہاں خانۂ دماغ کی اختراع نہ تھی بلکہ اس سوچ کا منطقی نتیجہ تھی جو کانگرس کے متحدہ قومیت اور ہندو اکثریت کے حربے کے مقابلے میں مزید مسلم اکثریت کے علاقوں کی تلاش کی صورت میں سامنے آئی کانگرس کے انتہا پسندانہ رویے کا ردِ عمل یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کو صوبوں کے طور پر منظم کر کا احساس مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا ایک اہم رکن ہو گیا۔

اس عمل اور ردِ عمل کے محرکات سے قطع نظر یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ آئینی جد و جہد اب نہایت واضح خطوط پر استوار ہونے لگی تھی - ایک طرف مرکز کے اثرات کو کم کرنے کے لیے وفاقی حکومت کی تجویز آئی اور دوسری طرف پنجاب اور بنگال کے علاوہ بعض اور رقبے بھی مسلمانوں کے م

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اس کے مقابلے میں کانگرس اور ہندو اکثریت نے ان جمہوری اداروں کو اپنا مطمح نظر بنایا جس سے متحدہ قومیت کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا اور اس تگ و دو میں ان تحفظات سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی جو میثاق لکھنؤ کے وقت مسلمانوں کو دینے کا اقرار کیا تھا۔ یہ کش مکش مسلمانوں کے داخلی احساس ملی کو خارجی سطح پر واضح آئینی لائحہ عمل میں ڈھالنے کا سبب بنتی گئی۔ بعض دانش مند ہندو ہندوستان کی جغرافیائی وسعت اور فرقہ وار مسائل کی شدت کو محسوس کر کے وفاقی طرزِ حکومت کے حامی بھی تھے لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ سی۔ آر۔ داس کو وقت کی رفتار کا احساس کرنے والے اکابر میں شمار کرنا چاہیے۔ اس نے ۱۹۲۵ء ہی میں انتقال سے چند ہفتے پہلے فرید پور میں بنگال پراونشل کانفرنس کی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے الجھے ہوئے آئینی مسائل کا حل وفاقی طرزِ حکومت کو قرار دیا تھا:

میں جو کچھ چاہتا ہوں اس کا ایک واضح تصور میرے ذہن میں موجود ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ریاستوں کا ایک ایسا وفاق قائم کیا جائے جس میں شامل ہر ریاست کو اپنے باشندوں کی تہذیب و ثقافت اور روایات کے مطابق عمل پیرا ہونے کی آزادی ہو۔ وفاق میں شامل ہر ریاست دوسری ریاستوں سے مشترک مفادات کے رشتہ میں مربوط ہو۔ یہ عظیم وفاق ایک عظیم تر وفاق میں شامل ہو، ایسی آزاد قوموں کے عظیم تر وفاق میں جن کی آزادی بنی نوع انسان کی خدمت کی ضامن اور جن کا اتحاد اقوامِ عالم کے لیے امید کا پیغام ہو۔

ہندو قوم میں سی۔ آر۔ داس جیسے حقیقت پسند رہنماؤں کی شدید قلت تھی۔ اکثریت ان کی تھی جو ہندوؤں کا مکمل اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے مسلمان قدرتی طور پر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مؤثر جدوجہد کرنے لگے۔

(۶)

مسلم مطالبات کی یہ دوہری علامت جس میں بیک وقت الگ حلقہ ہائے نیابت اور وفاقی طرزِ حکومت یک جا تھے اپنے اندر برصغیر کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی مسلم آبادی کی ملی وحدت کا تصور بھی رکھتی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو اکثریتی صوبوں میں ایک مؤثر حیثیت دینے کے لیے وفاقی طرزِ حکومت کے نظام کی داعی بھی ہے۔ جغرافیہ اور فکری تصورات کے درمیان ہم آہنگی کے رشتے ۱۹۲۵ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مسلمان لیڈروں کے ذہنوں میں کس طرح استوار تھے اس کی نوعیت واضح نہیں، لیکن مسلم لیگ کی ۱۹۲۵ء کی قرارداد تعبیر و تشریح کے ایک سے زیادہ پہلو رکھتی ہے۔ اس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ وفاقی طرزِ حکومت کی طرف میلان کے جذباتی اور عقلی روبتوں پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے۔ قرارداد کے پیچھے فکری احساس کے کئی پرت ہیں۔ وفاقی طرزِ حکومت کا تصور مرکز میں نظم و نسق کے مشترک پیمانے کے علاوہ اس بات پر منحصر ہے کہ صوبے یا ریاستیں اپنے اختیارات کو بروئے کار لانے میں وحدانی طرزِ حکومت کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوں گی۔ دوسرے وفاقی طرزِ حکومت ان علاقوں کے لیے سازگار ہے جن کی جغرافیائی حدود اتنی طویل و عریض ہوں کہ ان میں آب و ہوا، بود و باش، زبان اور نسل کے مختلف رنگ جا بجا ملتے ہوں۔ مسلمانوں کی دستوری تاریخ اس طرح کے تجربات سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ شخصی حکومتوں کے زمانے میں جب حکومت کی حدیں ایک سے زیادہ ممالک تک پھیل گئیں تو بنو امیہ اور بنو عباس کو بھی اپنی سلطنت کے دور دست علاقوں میں گورنروں کی سوجھ بوجھ پر بھروسہ کرنا پڑا اور مرکزی مداخلت صرف خاص خاص معاملوں میں دیکھنے میں آتی تھی۔ خود برصغیر میں جنوب کی ریاستیں اور مشرق کے صوبے نیم خود مختاری کی مختلف منازل سے گزرتے رہے۔ اور ان پر مرکز اپنے اختیارات کی تجدید فوجی اقدامات کے ذریعے ہی کرتا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی جغرافیائی حالت اس بات کا تقاضا کرتی رہی کہ مرکز میں اختیارات کو مجتمع نہ کیا جائے کیونکہ یہ اقدام غیر فطری اور غیر دانش مندانہ تھا۔ یاد رہے کہ وفاقی طرزِ حکومت کا مطالبہ صرف ملک کی جغرافیائی وسعت کا لازمی منطقی نتیجہ نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی فکری تاریخ میں ایسے شواہد موجود ہیں جو اس نتیجے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ تصور کہ برصغیر ایک ملک نہیں کئی ملکوں کا مجموعہ ہے، جغرافیائی سیاق و سباق میں ایک حقیقت ہے۔ لیکن جذباتی سطح پر اس مطالبے کی نوعیت اپنے تحفظ کے خوف پر منحصر نہیں بلکہ اس جذباتی رشتے کی نشاندہی پر ہے کہ ہزاروں برس کی شخصی حکومت بھی مسلمانوں کی داخلی آزادی کے سرچشموں کو خشک نہیں کر پائی۔ اس مطالبے کا ایک پرت یہ بھی ہے کہ وہ ملی تشخص جو ایک ہزار سال کی تاریخ میں کبھی کبھی دھیما ہوتا نظر آتا تھا اب پوری شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا اور مساوی حقوق کی بحالی کا امکان وفاقی طرزِ حکومت کے تار و پود میں دکھائی دے رہا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۷)

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں سیاسی لحاظ سے بہت کٹھن تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی تنظیمیں کمزور سے کمزور تر ہو رہی تھیں اور دوسری طرف کانگرس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ گاندھی نے تحریکِ خلافت کی حمایت اور ترکِ موالات۔ اور ستیہ گرہ کا شوشہ چھوڑ کر مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مفلوج کر دیا تھا۔ کانگرس فتح مندی کے غرور میں مسلمانوں سے کیے گئے عہد و پیمان سے روگردان ہو گئی۔ میثاقِ لکھنؤ فراموش ہو گیا۔ اب تحفظات کا کوئی سا مطالبہ بھی کانگرس کی نظر میں مشکوک، اور کوئی سی یقین دہانی جبی متحدہ قومیت کے منافی شمار ہونے لگی۔ شدھی اور سنگھٹن کی برملا حوصلہ افزائی ہوئی اور ہندو مسلم فسادات کی آگ کو تیز تر کیا گیا۔ کانگرسی راہنماؤں کے غیر ذمہ دارانہ بیانات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کانگرس اور ہندو رائے عامہ کے اس دوہرے دباؤ نے مسلمانوں کو "سوارا ج" کی حمایت میں قرار داد وں کے شغلِ بے کاری سے نجات دلائی۔ لیکن مسلم لیگ کی محدود اور کمزور اسٹیج باہمی اختلافات کی آماجگاہ بن گئی اور سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کا مسئلہ ایسا خطرناک ثابت ہوا کہ مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں ایک دھڑا شفیع لیگ کہلایا اور اس کا مرکز لاہور بنا۔ اور دوسرے حصے نے قائداعظم کی قیادت میں کلکتے میں سالانہ اجلاس کیا۔ اس باہمی ناچاقی سے کانگرس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

ان حالات کا بالواسطہ اثر یہ ہوا کہ مسلمان راہنماؤں نے فکری تاریخ میں شعور کی بیداری کا ثبوت دیا اور وہ حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ انھیں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں اپنی قوتوں کو یک جا کرنے کا احساس ہوا اور مسلمان اکثریتی صوبوں کی تشکیلِ نو کے مطالبے کے ساتھ یہ احساس بھی تیز تر ہوا کہ پنجاب، بنگال، سرحد، سندھ (صوبے بن کر) اپنے اپنے حقوق کے لیے سینہ سپر ہوں اور اس جغرافیائی اکائی کو مذہبی تشخص اور سیاسی تفوق بھی حاصل ہو۔ یہ احساس اول سیاسی مطالبے کی صورت میں پنجاب میں محسوس ہوا جہاں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے کہیں کم حقوق حاصل تھے۔ نواب ذوالفقار علی خان اور شیخ دین محمد نے اس بارے میں تحریری اور تقریری مہم کا آغاز کیا اور ۱۹۳۰ء میں اقبال نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پہلی بار اپنے صدارتی خطبے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے مستقبل کی ایک امکانی صورت کے طور پر بیان کیا۔ اس سے قبل ۱۹۲۸ء میں وہ اس مطالبے کو نہرو رپورٹ کے خالقین کے سامنے بھی پیش کر چکے تھے۔ مگر یہ مطالبہ وہاں رد کر دیا گیا تھا۔ دراصل ۱۹۳۰ء تک مسلمانوں کی رائے عامہ منظم نہ تھی اس لیے اُسے ایک تحریک کی صورت حاصل نہ ہو سکی تاہم اس شعور کا اولین نقش "متحدہ ہند میں اکثریتی صوبوں کے اختیارات کا مطالبہ" ضرور بار بار سامنے آتا رہا۔ صوبوں کے اختیارات کی اساس وفاقی طرزِ حکومت کی تجویز اور اکثریتی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے حقوق و مراعات کی دوسری تجویز وفاقی حکومت تک جانے کا ایک آئینی اقدام تھی جیسے مسلم لیگ نے ۱۹۲۴ء میں قرارداد کی صورت میں پیش کیا تھا۔ یہ مطالبات اس بات کا اظہار بھی تھے کہ وحدانی طرزِ حکومت مسلمانوں اور دیگر قوم کے تحفظ کی ضمانت دینے سے قاصر تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے آئندہ اگر کوئی بنیاد ہو سکتی تھی تو وفاقی طرزِ حکومت اور اکثریتی صوبوں کے اختیارات کے مسئلے اس کا لازمی جز تھے۔ اب مسلم لیگ کے پنڈال سے چرخہ کاتنے، کھدر بننے اور بغیر کسی شرط کے سوراج کا راگ الاپنے کی آوازیں بند ہو گئیں اور اس نوع کی قرار دادیں لیگ کے لائحہ عمل سے خارج ہو گئیں۔ یہ تبدیلی نئے نصب العین کی تلاش کی طرف اشارہ کر رہی تھی تاہم ابھی مسلمانوں کا ایک طبقہ کانگرس سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ ہندو مسلم فسادات کے دوران ہی میں قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں بعض سربرآوردہ مسلمان جمع ہوئے اور باہمی صلاح مشورے سے انھوں نے کچھ تجاویز منظور کیں جو دہلی مسلم تجاویز کے نام سے معروف ہیں۔ اس میں مشترکہ نیابت (Joint Electorate) کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی۔ بشرطیکہ مندرجہ ذیل امور پر کانگرس رضامند ہو جائے:

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۳۔ مسلمان سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ہندوؤں کو وہی رعایتیں دیں جو ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندو مسلمانوں کو عطا کریں۔

۴۔ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے۔

۵۔ مرکزی مجلسِ نمائندگان میں مسلمانوں کی ایک تہائی سے کسی طرح کم نمائندگی نہ ہو۔

© rasailojaraid.com

دسمبر ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کے اجلاسِ کلکتہ نے کونسل کو اختیار دیا کہ وہ ایک سب کمیٹی مقرر کرے جو دہلی کی تجاویز کی روشنی میں کانگریس سے گفت وشنید کرے۔ ہندوؤں نے ان تجاویز سے اتفاق نہ کیا اور ہندو مسلم اتحاد کا کوئی فارمولا وضع نہ ہو سکا۔

نومبر ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے ایک کمیشن کا اعلان کیا جو تاریخ میں سائمن کمیشن کہلایا۔ سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے مسائل لیگ کی صفوں میں اختلافات کا باعث بن گئے۔ مئی ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی ساختہ و پرداختہ نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ یہ رپورٹ کانگریس کی طرف سے ہندوستان کے آئین کا مسودہ تھی۔ اسی کے سامنے علامہ اقبال نے پنجاب، سندھ، سرحد میں ایک صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ نہرو رپورٹ درحقیقت ہندو مسلمانوں کی علیحدگی کا ایک اہم باعث ہوئی۔ کمیٹی نے میثاقِ لکھنؤ والی پوزیشن سے بھی انحراف کیا اور متحدہ ہندوستان اور اکثریت کی علمبرداری کے فلسفے کو راہنما اصول بنا کر اپنی تجاویز وضع کیں۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر غور وخوض کے لیے آل پارٹیز کنونشن بلایا گیا۔ مسلم لیگ کے جناح گروپ نے ۲۳ اراکین پر مشتمل کمیٹی ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کے لیے بنائی۔ کنونشن میں قائداعظم نے یہ تجاویز پیش کیں۔

۱۔ مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

۲۔ نہرو رپورٹ کا مجوزہ بالغ رائے دہی کا اصول اگر نہ مانا جائے تو آبادی کے تناسب سے پنجاب، بنگال کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے اور اس رعایت پر دس سال بعد دوبارہ غور کیا جائے کہ الگ نمائندگی جاری رہے یا ختم کی جائے۔

۳۔ بقیہ اختیارات Residuary Powers مرکز کی بجائے صوبوں میں مرتکز ہوں۔

۴۔ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنایا جائے۔ سرحد کو گورنر کا صوبہ نہ رکھا جائے بلکہ اسے مکمل صوبے کی حیثیت دی جائے۔ نہرو رپورٹ پر عمل سے پہلے اس کی [illegible] ہو۔

کنونشن نے قائداعظم کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ پہلی بار قائداعظم ہندو مسلم اتحاد اور نیشنلسٹ خیالات سے کسی قدر بدظن ہوئے اور اس لمحے کو ایک "الوداعی موڑ" قرار دیا۔ نہرو رپورٹ مسترد ہو گئی۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کے دونوں گروہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ جداگانہ انتخابات کے مسئلے پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اس دوران میں قائداعظم نے مسلم کی سابقہ قرار دادوں اور نئی صورت حال

© rasailojaraid.com

کی روشنی میں اپنے مشہور چودہ نکات وضع کیے، جس میں صوبائی تحفظات اور وفاقی نظام کا خاص طور پر ذکر تھا۔ یہ بھی مطالبہ تھا کہ پنجاب، بنگال اور سرحدی صوبے کے حدود کا دوبارہ تعین مسلمانوں کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں ملیں۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا جائے۔ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں ایک تہائی حصہ دیا جائے۔ تمام صوبوں کو یکساں صوبائی اختیارات ملیں اور آئندہ کا دستور وفاقی طرز پر ہو۔ جس میں صوبوں کو Residuary Powers دی جائیں اور مرکز صرف چند مشترکہ مفاد کے معاملات پر اختیار رکھے۔ چودہ نکات کے یہ اہم ترین اجزا تھے۔ ان میں وفاقی نظام کا تذکرہ خاص طور پر اہم ہے۔ متعلقہ عبارت یہ ہے:

آئندہ دستورِ حکومت وفاقی طرز کا ہو۔ اور یہ ایک ایسا وفاق ہو جس میں باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔

تمام صوبوں کو مساوی طور پر خود اختیاری عطا کی جائے۔

(۸)

دستوری جد و جہد میں مسلمانوں نے اپنے مفادات کا تحفظ جداگانہ حق نیابت سے سر کر لیا تھا۔ کانگرس کے انکار کے باوجود مسلمان اس بات پر مطمئن نظر آتے ہیں کہ یہ حاصل شدہ متاع ان سے چھین لینا آسان نہیں۔ کانگرس نے انھیں مراعات پر کاری ضرب لگانے کی ٹھانی تھی اور گول میز کانفرنس کی ناکامی کا سبب یہی اختلافات تھے۔ تاہم مسلمانوں کے اصل مطالبات ابتدائی حدود سے نکل کر دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی توجہ کا اصل محور در حقیقت صرف دو نکات تھے۔

۱۔ پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ اور بنگال کے اکثریتی علاقوں میں حقوق کی حفاظت اور مؤثر اقتدار کا نہ قوت کی تدابیر۔

(اس پہلو پر زور کا منطقی نتیجہ پہلے مملکت کے اندر ایک مملکت کا تصور تھا اور پھر آزاد اور مختار ریاست (پاکستان) کا مطالبہ)

۲۔ وفاقی طرزِ حکومت کی خواہش جو برِّصغیر کی جغرافیائی حالت کا دستوری حل تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک کے دور میں مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی جبھی ممکن تھی کہ مسلمان، رائے عامہ اس کے پیچھے متحد ہوتی اور مسلمان من حیث الجماعت انگریز اور کانگرس سے اقتدار میں شرکت کا مطالبہ کرتے۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے مسئلے نے ۱۹۳۰ء میں اقبال کے خطبۂ الہ آباد میں برطانوی اقتدار کے اندر یا باہر ایک متحدہ مسلم مملکت کا امکانی روپ ابھرا تھا۔ لیکن وہ آواز اس لیے غیر مؤثر رہی کہ رائے عامہ ابھی منظم نہ تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جب اقبال کا پیغام مسلمانوں کے دلوں کو گرمانے میں پوری طرح کامیاب ہوا اور اقبالی نوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تو پھر ایسے مطالبے کا موقع آیا۔ کم و بیش اسی زمانے میں ہندو مسلم فسادات کے بعد ہندوؤں کے ہاں نیم عسکری تربیت کو فروغ ہوا۔ مسلمانوں کے ہاں بھی نیم عسکری تحریکیں ابھریں۔ خاکسار تحریک نے ظاہری اور عسکری لحاظ سے اور مجلس احرار نے احتجاجی سیاست کے ذریعے مسلمانوں کو جگا دیا۔ اس سے مسلمانوں کے شعورِ سیاسی کے بیدار ہونے میں بڑی مدد ملی۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں تحریکیں مسلمانوں کے باطنی طرزِ احساس کا صحیح ادراک نہ کر سکیں اور برباد ہو گئیں۔ آئینی سطح پر گول میز کانفرنسوں کا انعقاد وفاقی طرزِ حکومت کی افادیت پر مہر تصدیق ثبت کر گیا۔ آئندہ کی دستوری سفارشات کے بارے میں یہ بات یقینی ہو گئی کہ ہندوستان کو جو بھی دستور دیا جائے گا وہ وفاقی ہو گا۔

(۹)

وفاقی طرزِ حکومت گول میز کانفرنس میں زیرِ بحث آئی۔ قائداعظم نے اس مسئلے پر اظہارِ رائے کیا اور وفاقی طرزِ حکومت کے بارے میں اپنے خیالات بالوضاحت پیش کیے۔ ان آرا کی روشنی میں قائداعظم کی وفاقی طرزِ حکومت کے بارے میں تصورات سے پوری آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بحثوں کے دوران میں برصغیر کے دو اہم انتظامی حلقوں کو ایک نظام میں سمونے کے لیے مختلف تجاویز پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ ایک طرف برطانیہ کے زیرِ نگین صوبے تھے اور دوسری طرف راجاؤں اور نوابوں کے زیرِ اقتدار ریاستیں تھیں۔ قانونی لحاظ سے دونوں کو ایک ہی وفاقی نظام میں منسلک کرنے کے لیے ریاستی حکمرانوں کی رضامندی اور اپنے اپنے اختیارات سے دست برداری کا معاملہ بھی تھا۔ دوسری طرف ۱۹۱۹ء کے ایکٹ سے یک لخت الگ ہو کر صوبوں کے لیے اپنے آپ کو نئے نظام میں منسلک کر دینے کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ دو ایوانی مرکز میں براہ راست انتخاب یا

© rasailojaraid.com

بالواسطہ انتخاب کے طریق کار کے بارے میں بھی تفصیلات طے کرنے کی ضرورت تھی۔ حکومت کے اختیارات، مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم، بین الصوبائی معاملات، سندھ کے صوبے کا قیام، انتظامیہ کے اختیارات اور دفاع اور فیڈرل کورٹ کے مسائل کے بارے میں قائداعظم نے بڑی تفصیل سے فیڈرل اسٹرکچر سب کمیٹی کے یکم دسمبر ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۳ جنوری ۱۹۳۱ء تک کے اجلاسوں میں تمام امور پر روشنی ڈالی۔ قائداعظم فیڈرل نظامِ حکومت کو دستوری مسائل کا نہایت کامیاب حل قرار دیتے تھے لیکن برطانیہ کے حتمی فیصلے کے بارے میں اس یقین دہانی کے باوجود کہ برطانیہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نوآبادیات) دے گا۔ وہ برطانوی اکابر سے یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ وفاقی نظام کی اصل روح سلب کر کے کہیں محض برائے نام وفاقی دستور نہ دے دیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی حالت اور ہندو اکثریت کے رویے کے پیشِ نظر وہ وفاقی دستور کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دستور کے مباحث میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی مقبوضات کو وفاق میں منسلک کرنے کے لیے ان کی تجویز یہ تھی کہ معاہدے کی رُو سے ریاستیں اپنے اختیارات مرکز کو تفویض کریں گی۔ اسی طرح برطانوی مقبوضہ صوبے جب وفاقی نظام سے منسلک ہوں گے تو ایک درمیانی وقفہ آئے گا جب یہ بھی خود مختار ریاست (sovereign states) ہوں گے اور اپنے اختیارات کا ایک حصہ مرکز کے حوالے کر دیں گے۔ خود مختار ریاست سے قائداعظم نے جیسا کہ خود کہا ہے ان کی مراد with residuary powers in the provinces ہے۔ قائداعظم کے نزدیک انتقالِ اختیارات کا یہ مرحلہ قانونی لحاظ سے ناگزیر ہوگا۔ اسی لیے وہ صوبوں اور ریاستوں کو وفاقی دستور کے حوالے سے ہمیشہ sovereign states کہتے رہے۔ ان کی رائے میں وفاقی نظامِ حکومت کا فلسفہ دراصل ایک معاہدے پر منحصر ہے جس میں آزاد اور خود مختار ریاستیں ایک وفاق میں منسلک ہونے کے لیے اپنے اپنے اختیارات کا کچھ حصہ باہمی رضامندی سے مرکز کے تفویض کرتے ہیں۔ قراردادِ لاہور (۱۹۴۰ء) میں صوبوں یا ریاستوں یا یونٹوں کو اسی مفہوم میں Independent sovereign کے لفظوں سے بیان کیا گیا ہے کہ قراردادِ لاہور کی جملہ اصطلاحات وفاقی دستور ہی کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں اور خالقِ پاکستان اس قرارداد کی رُو سے بین السطور میں وفاقی دستور کا نقشہ اس ملک کے لیے تجویز کر رہے تھے۔ بہرحال بات ۱۹۳۰ء کے سب کمیٹی کے

© rasailojaraid.com

اجلاس کی ہو رہی تھی۔ قائداعظم نے مرکزی حکومت کے محکموں میں دفاع، خارجہ پالیسی اور فوج کو مرکزی محکمے قرار دیا ہے۔ اسی طرح مرکز میں دو ایوانی ڈھانچے میں زیریں ایوان کے اراکین کا انتخاب براہِ راست اور ایوانِ بالا کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں کی وساطت سے تجویز کیا ہے۔ بعض دوسرے حلقوں مثلاً مزدوروں کی نمائندگی کے لیے لیبر یونینوں کو حق انتخاب دینے کی تجویز کی ہے۔ اقلیتی فرقوں کو بھی علیحدہ نمائندگی کی تجویز ہے اور اس بات کی شدت سے مخالفت کی ہے کہ ان میں سے کسی بھی نشست پر نامزدگی کی جائے۔ وہ نامزدگی کو غیر جمہوری طریقہ قرار دیتے ہیں۔ مرکز میں گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کے سلسلے میں آرڈی نینس کے ذریعے قوانین کی ترمیم یا نئے قانون کا نفاذ بھی انھوں نے ناپسند کیا ہے۔ نیز ایسے خصوصی اختیارات کی بھی مخالفت کی ہے جس کی زد کسی فرد کی زندگی، آزادی یا جائیداد پر پڑتی ہو[۵۲]۔ اسی طرح گورنر جنرل کے خاص مالی اختیارات و تحفظات کی بھی انھوں نے مخالفت کی ہے۔ وہ صرف ہنگامی حالت میں ایسے خصوصی اختیارات دینے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ بھی صرف انتظامی اختیارات۔ آرڈی نینسوں کے ذریعے قانون سازی کا حق دینے کی قائداعظم نے شدید مخالفت کی[۵۳]۔

صوبوں کے اختیارات کے ضمن میں وہ بین الصوبائی معاملات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے خیال میں صوبائی مدات میں اشتراک کے لیے بین الصوبائی سطح پر کوئی نظام وضع کرنا بھی نامناسب ہے[۵۴]۔ وزارتوں کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ عدمِ اعتماد کی صورت میں شکست کے لیے ووٹوں کی کوئی خاص تعداد مقرر کرنا غلط ہوگا۔ اگر حکومت ایک ووٹ سے بھی شکست کھا جائے تو اُسے بے دخل کر دینا چاہیے[۵۵]۔

(۱۰)

قائداعظم کے یہ تصورات صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔ برطانیہ نے ۱۹۳۵ء کا قانون وضع کیا تو

---

۵۲ Speeches and Statements of Quaid-i-Azam (Rafia Afzal) PP 441-442

۵۳ ایضاً، ص ۳۵۵

۵۴ ایضاً، ص ۳۵۷

۵۵ ایضاً، ص ۳۵۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے محض نام کا وفاقی رکھا۔ قائداعظم دوسری گول میز کانفرنس کے بعد حالات سے مایوس ہو کر انگلستان ہی میں بس گئے۔ ہندو کانگرس کا رویہ بہت سخت رہا اور چار برس تک برصغیر کی سیاسیات سے اُن کا کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس دوران میں ۱۹۳۵ء کا قانون منظور ہوا۔ طے پایا کہ اس کا صوبائی حصہ یعنی صوبائی خود اختیاری کو نافذ کر دیا جائے لیکن مرکز (فیڈرل) کا ڈھانچہ بالفعل ملتوی رہے۔

ہندو اور سکھ لیڈروں کا طرزِ عمل گول میز کانفرنسوں کی ناکامی اور قائداعظم کی مایوسی کا سبب تھا۔ یہ لیڈر مفاہمت کے کسی فارمولے پر بھی متفق نہ تھے حالانکہ قائداعظم اس زمانے تک جداگانہ نیابت بھی چھوڑنے پر راضی تھے۔ بشرطیکہ ہندو، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نشستیں دینے پر رضامند ہو جائیں۔ اس مؤقف کے دو پہلو اہم ہیں: اوّل یہ کہ مفاہمت کی خاطر جداگانہ نیابت کو ترک کرنے پر رضامندی تاکہ اتحاد قائم رہ سکے۔ دوم، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے مطابق نمائندگی۔ یہ دونوں مؤقف بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ متحدہ قومیت کے لیے جداگانہ نیابت سے دست برداری اور ساتھ ہی اس پر اصرار کہ پنجاب اور بنگال میں مذہبی بنیادوں پر حق نمائندگی ہو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ قائداعظم ابھی تک نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے اور کانگرس سے نہیں صرف کانگرس کے برسرِ اقتدار ہندو طبقے سے بدظن تھے تو پھر اس مؤقف میں تضاد باقی نہیں رہتا۔ اس طریقِ استدلال کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ شق دوم کا ایک سرا اس احساس سے بھی مربوط ہے کہ مسلمان پنجاب اور بنگال میں کثرتِ آبادی کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے اور یہی وہ احساس ہے جس نے انھیں مجرد تصور (تصورِ ملت) کو جغرافیائی حقیقت (پاکستان) میں بدلنے کا احساس دلایا۔ جغرافیے کی طرف قائداعظم کی پیش قدمی کا نقطۂ آغاز گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کا رویہ بھی تھا۔ اس گفت و شنید کے تجربے نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ اپریل ۱۹۳۴ء تک وہ "سفیرِ اتحاد" کہلانے کی بجائے اب اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ سمجھنے لگے تھے۔ اس مسلک نے انھیں برصغیر کے جغرافیائی خط و خال پر ایک نئے انداز میں غور کرنے پر مجبور کیا۔ برطانیہ کی جائنٹ سلیکٹ کمیٹی اس زمانے میں قرطاس ابیض پر غور کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ تھا جو صرف برائے نام وفاقی دستور تھا اور اصل قوت مرکز ہی میں تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوبوں کی حیثیت مرکز کے مقابلے میں کچھ زیادہ با اختیار نہ تھی۔ نیز مرکز میں ہندو اکثریت پورے برصغیر کی مختار تھی اور مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی اس اکثریت کو کسی طور متاثر کرنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ ایکٹ کا دو ایوانی وفاقی حصہ کچھ عرصہ ملتوی رہا اور صوبائی خود اختیاری والے حصے پر عمل شروع ہوا۔ یہ توقع تھی کہ شاید صوبوں کی سطح پر یہ تجربہ بہتر نتائج پیدا کر سکے لیکن ۱۹۳۷ء کے الیکشن کے بعد کانگرس نے اپنے اکثریتی صوبوں میں حکومتیں قائم کیں اور مسلمانوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس سے صوبائی سطح پر بھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا تجربہ مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول ہو گیا۔ مسلم لیگ، قائداعظم کی قیادت میں، حالات کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں صوبوں کی مذہبی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر از سرِ نو تقسیم کا مطالبہ کیا گیا۔ قائداعظم کا یہ مطالبہ ان کے نیشنلسٹ خیالات سے کوئی علاقہ نہ رکھتا تھا۔ اس کی جڑیں اس حقیقت پر استوار تھیں کہ مسلمان ان علاقوں میں اپنا تشخص چاہتے ہیں جہاں انھیں اکثریت حاصل ہے۔ "حقوق کی حفاظت" سے "تشخص کی منزل" کی طرف پیش قدمی قائداعظم کے خیالات میں اہم تبدیلی کی خبر دیتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کے موقع پر قائداعظم نے جو خطبہ دیا اس میں انھوں نے مسلمانوں کے "ملی تشخص" پر زور دیا اور بتایا کہ مسلمان قومیت کی ہر تعریف و تعبیر کے مطابق ایک الگ قوم ہیں، انھیں اقلیت قرار دینا صحیح نہیں۔ انھوں نے یہ واضح فرمایا کہ ہندوستان کا مسئلہ فرقہ داری نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت بین الاقوامی ہے اور اس اہم حقیقت کو تسلیم کر کے ہی یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم تصور کر لینا ایسا خیالِ خام ہے جو ہندوستان کے تمام مصائب و مشکلات کی جڑ ہے اور اس بنیادی غلطی کی بروقت اصلاح نہ کی گئی تو ہندوستان بالکل تباہ ہو جائے گا۔

(۱۱)

قائداعظم کے ارشادات اور علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد کے بنیادی تصورات میں ایک قریبی مماثلت ہے۔ اس مشابہت کے علاوہ ایک فرق بھی ہے۔ دونوں راہنما ایک ہی بنیادی حقیقت تک مختلف راستوں سے پہنچے۔ اقبال نے فلسفیانہ فکر کے وسیلے سے مسلمانوں کے "ملی تشخص" کے فرق کو پہچانا۔ وہ وطن کی محبت کو نفسیاتی حقیقت کے طور پر قبول کرنے کے بعد اس کی توسیع کرتے ہیں اور اسے ایک مجرد تصور کی شکل میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا ذہنی سفر مکان سے زمان کی طرف ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائداعظم نے "سیاسی حالات" کے ذریعے اس مجرد تصور تک رسائی حاصل کی ہے۔ وہ آغاز "وطن کی محبت" سے نہیں کرتے بلکہ "طریقِ بود و باش" سے چلتے ہیں اور مجرد تصورات تک آجاتے ہیں۔ ان کے خیالات کا سیاق و سباق فلسفیانہ نہیں واقعاتی ہے۔ اقبال کے ہاں فکر اور قائد کے ہاں تجربے کا پلہ بھاری ہے۔ فکر اور تجربے کا یہ فرق دونوں کے اندازِ نظر پر اثر انداز ہوا۔ قائداعظم نے ایک ماہر سیاست دان کی طرح مقصد کے حصول کے لیے "حکمتِ عملی" بھی وضع کی۔ ایک طرف تو وہ کانگرس سے نمٹنے کے لیے گفت و شنید کے دروازے کھلے رکھتے ہیں اور دوسری طرف حصولِ پاکستان کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں لگے رہے۔ جب رائے عامہ منظم ہوگئی تو پاکستان کے لیے قانونی ذرائع کو خیرباد کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اقبال اور قائد میں فلسفے اور عمل کا یہ فرق اصطلاحات کے استعمال میں بھی پایا جاتا ہے۔ اقبال نے جس صداقت کو "وطن کی محبت" کی اصطلاح سے یاد کیا تھا اور جذبۂ ملی میں بدلنے کی سفارش کی تھی، قائداعظم نے اسی صداقت کو "جغرافیے" کی زبان میں ادا کیا۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو الگ وطن کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ اپنی زندگیاں اپنے مذہبی اعتقادات کے مطابق بسر کر سکیں۔ قائداعظم نے بھی پاکستان کو "اسلام کی تجربہ گاہ" ہی قرار دیا لیکن قائد کے سامنے دلائل کا جو سلسلہ تھا وہ اقبال کے استدلال سے مختلف ہے۔ قائد کے نزدیک یہ مطالبہ صرف ایک مذہبی اور ثقافتی مطالبہ ہی نہیں ایک سیاسی مطالبہ بھی ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اقلیت نہیں، ایک قوم ہیں۔ اور ایک قوم کے لیے اس کا اپنا وطن ہونا بھی لازمی ہے۔ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایک قوم ہیں کوئی فائدہ نہیں۔ قوم ہوا میں نہیں رہتی۔ زمین پر بستی ہے۔ اور یہ لازمی امر ہے کہ قوم اپنی سرزمین پر حکومت کرے اور اس کی اپنی مملکت ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں [۵۶]

قرارداد لاہور کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ قرارداد جس وقت منظور کی گئی ابھی برطانوی اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ حصولِ آزادی کی منزل دور دکھائی دے رہی تھی، دستوری جدوجہد

---

۵۶ Speeches statements of Quaid-i-Azam — Jamil ud din Ahmed (March 1941.)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ذریعے اس منزل تک پہنچنے کا راستہ دشوار گزار بھی تھا اور طویل بھی، جس میں مسافر کے لیے منزل بہ منزل ٹھہرنے اور پڑاؤ کرنے کے مقامات بھی آتے تھے۔ اسی لیے قرارداد کی زبان کسی قدر مبہم اور تہ در تہ ہے۔ اس میں مفاہمت اور گفت و شنید کی لچک بھی ہے اور "زیرِ سایۂ تاجِ برطانیہ" کچھ عرصہ بسر کرنے کا عندیہ بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کامل آزادی کی نوید بھی اسی عبارت میں مضمر ہے۔ اس نئی مملکت کا دستور کیا ہوگا، اس کا اشارہ بھی ہے۔ یعنی قرارداد میں وفاقی طرزِ حکومت کا نقشہ بھی ہے۔ اپنے خطبہ میں قائداعظم نے جہاں مسلمانوں کو جداگانہ قوم کہا تھا وہاں پورے ہند کے لیے ایک وفاق کی مخالفت بھی کی تھی۔ قراردادِ لاہور کی (جسے عموماً قراردادِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے)، جملہ اصطلاحات وفاقی دستور سے ماخوذ ہیں۔ میری رائے میں قرارداد میں States کا لفظ بھی یونٹوں، ریاستوں یا صوبوں کے معنوں میں برتا گیا ہے۔ اس کی زبان سے دھوکا کھا کر بعض مؤرخین نے قراردادِ لاہور سے دو مسلمان مملکتوں کا تصور برآمد کر لیا حالانکہ قرارداد کی عبارت کا پورا نظام وفاقی دستور سے اخذ شدہ ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جغرافیائی فاصلے اور مسلم آبادی کے مختلف علاقوں میں ترقی کے متفاوت مدارج کی وجہ سے قائداعظم کے ذہن میں وفاقی دستور ہی رچا بسا تھا اور پاکستان اور وفاقی طرزِ حکومت ان کی نظر میں لازم و ملزوم تھے۔

(۱۲)

برصغیر کی سیاسی صورت حال نے قائداعظم کو بالآخر اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ پورے برصغیر میں عارضی طور پر بھی یا درمیانی منزل کے طور پر بھی "متحدہ ریاست" ناقابل پذیرائی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے بعض اکابر کے ڈھیلے ڈھالے وفاق کی تجاویز کو بھی رد کر دیا اور ۱۹۴۶ء میں اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ قراردادِ لاہور کی عبارتوں کو تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیجسلیٹرز کنونشن میں مطالبے کو واضح تر کر دیا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں حصولِ پاکستان ناگزیر نظر آنے لگا تھا۔ اب کسی عارضی انتظام کی ضرورت نہ رہی۔ اس کے علاوہ مزید غور و خوض نے وفاقی نظام کی ایک کمزوری بھی قائداعظم پر واضح کر دی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے وفاقی نظام میں بھی مرکز مرورِ ایام سے اپنے اختیارات میں توسیع کر لیتا ہے اور ریاستوں یا صوبوں کے اختیارات بہ آسانی سلب ہو سکتے ہیں اور یہ کہ وفاقی نظام برصغیر کی مشکلات کا واحد حل نہیں بلکہ واحد حل آزاد مسلم مملکت کا مطالبہ ہے۔ اس لیے قائداعظم نے عارضی منزل کو بھی رد کر دیا اور کسی قسم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ڈھیلے" وفاق کا منصوبہ بھی قابل قبول نہ تھا۔ اس کی وضاحت، بڑی تفصیل کے ساتھ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمادی۔

۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ نے "متحدہ ہندوستان" کے پس منظر میں ہندوستان کی جملہ مشکلات کا حل وفاقی طرزِ حکومت قرار دیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں یہ احساس ہو چکا تھا کہ چاہے صوبائی سطح پر کتنا بھی اختیار دے دیا جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو کتنے ہی تحفظات حاصل ہوں، وفاقی نظام حکومت میں مرکز اپنے اختیارات کو آہستہ آہستہ وسیع کرنا چاہتا ہے اور پورے برصغیر میں مسلمانوں کی عددی حیثیت انھیں ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈال دے گی اور مسلم اکثریت کے صوبے بھی مرکز کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لیے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں ان پر مشتمل جداگانہ آزاد مملکت کا قیام ہی مسلمانوں کے مسائل کا حل ہو سکے گا۔ "وفاقی دستور" مسلمانوں کو "آزاد وفاقی سلطنت" کے تصور تک لے آیا۔

(۱۳)

۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہو گیا اور قائد اعظم اس کے پہلے گورنر جنرل ہوئے۔ قائد اعظم اس زمانے تک پاکستان کے دستور کے بارے میں جو زبان استعمال کرتے رہے، وفاقی طرزِ حکومت کے حوالے ہی سے تھی۔ لیکن گورنر جنرل بننے کے بعد مجلسِ قانون ساز کے ذمے پاکستان کے آئین کی تشکیل کی ذمہ داری تھی اس لیے قانونی ضابطہ پسندی نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کریں۔ یہ حق مجلسِ قانون ساز کا تھا۔ اگرچہ انھوں نے پاکستان کے آئندہ دستور کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا تاہم ان کی تقاریر اور بیانات اس کے غماز ہیں کہ وہ وفاقی دستور ہی کو پسند کرتے تھے، جن کی تفصیلات اسلام کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

دستور ساز اسمبلی میں ان کی تقاریر کو سابقہ تقاریر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ تقریر ان کے پرانے تصورات کی نفی نہیں کرتی اور نہ دینی ریاست کی جگہ سیکولر ریاست کی تائید میں ہے۔ وہ اسلامی ریاست اور تھیوکریٹک ریاست کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کا محور لادینی ریاست اور دینی ریاست کی دو انتہائیں نہیں بلکہ تھیوکریٹک ریاست اور اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریاست کے درمیان فرق ان کے تصورات کا اصل محور ہے۔[۵۷] انھوں نے بارہا اعلان کیا کہ پاکستان تھیوکریٹک ریاست نہیں ہوگا بلکہ اسلامی ریاست ہوگا۔[۵۸] چنانچہ مجلس قانون ساز کی تقریروں کو سابقہ تقاریر کے سیاق سے الگ کرکے دیکھنا درست نہیں ہوسکتا۔

---

۵۷ ملاحظہ ہو: Reference in Supreme Court of Pakistan.
مورخہ ۲۷ راگست ۱۹۷۵ء پیراگراف ۲۸۱ تا ۲۹۰، صفحات ۱۳۳ تا ۱۳۹

۵۸ ایضاً، ص ۱۳۵ بحوالہ قائد اعظم کی پریس کانفرنس، ۱۴ رجولائی ۱۹۴۷ء

برِّصغیر پاک و ہند میں علم فقہ

از محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برّصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا۔ یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برّصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتب فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

قیمت: ۱۳/۲۵ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com